نسخہ

جوہر آئینہ

یعنی

آئینہ

جس میں ہماری شاعری نوشتہ جناب مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی
ادیب صدر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی کی مفصل تنقید ہوگی یہ جلد اول کی قسط اول

مصنفہ

عالیجناب مولوی محمد احمد صاحب تجو دموہانی (ایم اے) پروفیسر شیعہ کالج لکھنؤ

پبلشر - انوار بک ڈپو

باہتمام احقر زمن محمد حسن

انوار المطابع لکھنؤ میں طبع ہوئی

قیمت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

بیا و رید گر اینجا بود زباندانی
غریب شہر سخنہای گفتنی دارد

"گنجینۂ تحقیق" کی اشاعت کے بعد خامۂ حقیقت نگار آرام کی نیند سویا اور یون سویا کہ سیر جنبش بھی کروٹ تک نہ بدلی اب مدت بعد بیدار ہوا ہے اور

پھر پیش جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمکدان لئے ہوئے

پھر جی مین ہے کہ کچھ وقت عزیز تنقید کے دلآویز مشغلہ کی نذر کیا جائے اور اس نظر سے مین نے "ہماری شاعری" مؤلفہ جناب مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے۔ صدر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی کو انتخاب کیا ہے جناب مؤلف اور انکی کتاب شعرا و فصحا کے طبقے اور ادبا و کملا کے حلقے مین محتاج تعارف ہون تو ہون لیکن سررشتۂ تعلیم انھین خوب جانتا ہے سنتا ہون کہ جناب مؤلف کئی یونیورسٹیون کے ممبر ہین اور انکی یہ کتاب کئی یونیورسٹیون کے نصاب مین داخل ہے۔ جب یہ کتاب پہلے پہل شائع ہوئی تھی تو ارادہ ہوا تھا کہ اسپر مفصل تنقید کردی جائے۔ مگر خیال گذرا کہ ہندوستان ابھی ارباب سخن سنج سے خالی نہین کوئی نہ کوئی اسے تنقید کی کسوٹی پر کس دیگا۔ یہ بلا اپنے سر کیون لیجائے مگر صدائے برنخاست کا عالم رہا۔ اخبارون مین تقریظون کا غلغلہ رہا رسالون مین تعریفون کا ہنگامہ رہا مگر تنقید اسپر آجتک ڈھونڈھے نہین ملتی بعض احباب نے ادھر کچھ توجہ بھی فرمائی اور چلتی ہوئی نظر بھی ڈالی مگر یہ زحمت بیشتر بے دل کر رہ گئے اسکا واقعی سبب علام الغیوب

جانے بخانے ارباب نظر نے اسکی طرف آنکھ اٹھاکر دیکھنا ضروری سمجھا یا یہ دیکھکر سکوت فرمایا کہ جیسی قدر افزائی ہونی چاہئے تھی ہو رہی ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ جناب سید جالب دہلوی مرحوم سا باخبر اور اہل نظر زندہ تھا ہمدم سا روزنامہ اسکی ادارت پر ناز کرتا تھا مگر اس کتاب کے متعلق اسکا ایک حرف بھی سرمہ اہل بینش نہوا جناب مولانا سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی سا محقق زندہ اور اپنے برج کا الم تھا۔ مگر ہمارے علم و یقین میں انہوں نے اس کتاب پر قلم نہیں اٹھایا۔ چشم و چراغ کمال اہل کمال جناب مرزا محمد ہادی رسوا بی۔ ایچ۔ ڈی سا جامع معقول و منقول بقید حیات تھا مگر اس کتاب کے متعلق انکی کوئی تحریر نظر نہیں آئی۔ ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کتاب چمن کی بہار ہے یا بن کی آگ مگر یہ بی۔ اے کے نصاب میں داخل ظاہر ہے کہ یونیورسٹی میں بی۔ اے کا درجہ قریب قریب تعلیم اردو کیلئے آخری درجہ ہے۔ ایم۔ اے کے درجہ میں اردو لینے والے برائے نام ہوتے ہیں اسلئے اگر یہ کتاب مایۂ تحقیق و سرمایۂ تدقیق ہے تو یقیناً بی۔ اے کے نصاب کیلئے ایسی کتاب ملنا مشکل ہے اور اگر خدا نا کردہ ایسا نہیں ہے تو نتیجہ ظاہر ہے یعنی

خشت اول چون نہد معمار کج　　　تا ثریا می رود دیوار کج

ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ میری کتاب (آئینہ) ہماری شاعری کیلئے تہنیت کا ترانہ مسرت کا شادیانہ ہے یا اردو زبان کا مرثیہ اردو شاعری کا نوحہ ہے

مجھے ہماری شاعری سے مفصل بحث نہیں اور نہ یہ دکھانا ہے کہ مؤلف علام نے کہاں کہاں خوش فہمی کی ہے اور کہاں کہاں نکتہ آفرینی علمائے بلاغت کے اقوال کہاں کہاں سہو ہو گئے ہیں کہاں کہاں مسخ ہو گئے ہیں نہ اسلئے تحقیق کی آئینہ داری ہیں یا آئینۂ تحقیق کا زنگار مؤلف بدل کی شگفتہ متانت سنجیدہ ظرافت سادہ رنگینی پرکار سادگی سبھی کی داد دیتا ہے مگر اسباب مطلب میں ہیں کچھ جو کچھ سمجھے گا وہی بات پر لاؤنگا اور جو آنکھ دیکھے گی وہی دنیا کو دکھاؤنگا۔ آئینہ کی جلد اول انشاء اللہ ڈیڑھ سو صفحہ تک جائے گی آئندہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آخری اشاعت صفحہ ۵۶

ہماری شاعری کا مقدمہ

"ارشاد جناب ادیب "مناسبت الفاظ۔ اس کی دو صورتیں ہیں ایک لفظ کی مناسبت خیال سے. دوسری لفظ کی مناسبت لفظ سے پہلی صورت بلاغت کلام میں داخل ہے۔ دوسری فصاحت کلام میں پہلی صورت کی پھر دو حیثیتیں ہیں ایک مناسبت آواز کے اعتبار سے دوسرے مناسبت معنی کے اعتبار سے۔ اس طرح مناسبت الفاظ کی تین شکلیں ہوئیں۔ ذیل میں ہر شکل کا بیان کسی قدر تشریح کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

لفظ کی مناسبت خیال سے بہ اعتبار آواز کے۔ بعض لفظوں کی آواز نرم اور نازک ہوتی ہے۔ بعض کی سخت اور کرخت بعض کی آواز شیریں اور لطیف ہوتی ہے۔ بعض کی بھیانک اور مہیب اس لئے جیسی بات کہنا ہو ویسے ہی لفظ لانا چاہیئے محبت کا اقرار نرم لفظوں میں ہونا چاہیئے۔ غصّے کا اظہار سخت لفظوں میں ایسا کرنے سے لفظوں کی آواز اُن کے معنی کو اور بھی واضح

کر دیتی ہے اور کلام کا اثر بڑھ جاتا ہے۔

مناسبت الفاظ کی پہلی صورت کی مثالیں

جو تمھاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا تمھیں منصفی سے کہدو تمھیں اعتبار ہوتا

اس شعر میں عاشق معشوق سے وعدہ خلافی کی شکایت کرتا ہے اس لئے ایسے ہی نرم الفاظ مناسب تھے کہ محبوب کے نازک دل پر گران نہ ہون۔ اور جو اثر مطلوب ہے وہی پیدا ہو۔ لیکن اگر کوئی فوجی افسر ماتحت سپاہیون سے عدول حکم پر باز پرس کرنے مین اسی طرح کے الفاظ استعمال کیا کرے تو جو اثر ہوگا وہ ظاہر ہے۔"

التماس ہیچمدان۔ مؤلف علام نے شعر مذکورۂ بالا کے الفاظ کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ معشوق سے وعدہ خلافی کی شکایت مین ایسے ہی نرم الفاظ مناسب تھے کہ محبوب کے نازک دل پر گران نہ ہون۔ اب مین حیران ہون کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے اگر نرم الفاظ یہی ہین تو سخت الفاظ کیسے ہوتے ہین۔ مصرع اول "جو تمھاری طرح" سے شروع ہوتا ہے یعنی اشارہ کنایہ سے کام نہین لیا جاتا۔ اداے مطلب کے لئے کسی اور واقعہ یا فرضی قصہ کی ضرورت نہین سمجھی جاتی بلکہ معشوق خود ہی مثال مین پیش کیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ جس کلام کی ابتدا اس دریدہ دہنی سے کی جائے وہ درشت مزاج آدمی کو آمادۂ جنگ کر دے گی اور نازک مزاج آدمی کو ہمیشہ کے لئے متکلم کی صورت کیسی نام سے بیزار کر دے گی یہ انداز کلام

ایک بدمعاش ایک مجرم کے مقابلہ میں برمحل ہو تو ہو کسی نازک دل کسی نازک مزاج کے لئے تو دشنام سے کم نہیں پھر وہ نازک دل نازک مزاج کوئی اور بھی نہیں خود معشوق ہے ایسی صورت میں ایسی مثال کہاں تک مناسب ہے اس کا فیصلہ ارباب نظر کر سکتے ہیں اچھا اور آگے بڑھئے "تم سے" دیکھئے ضمیر کس قدر نزاکت اور نرمی کا پہلو لئے ہوئے ہے یاد رہے کہ یہ محل شکایت ہے اور شکایت بھی نازک مزاج اور نازک دل معشوق سے جسے آمادۂ رحم کرنا منظور ہے اب ظاہر ہے کہ اس شکایت کا انجام صلا متشد بلا شبہ ہے۔

۳ "جھوٹے وعدے کرتا" یہاں تو نرمی کی حد ہو گئی یہ ایسے معشوق سے کہا جا رہا ہے جو نازک مزاج اور نازک دل ہے اور کس حیا کی سے کہ تم جھوٹے وعدے کرتے ہو۔

۴ "منصفی سے کہہ دو" تم نامنصف بھی ہو۔

۵ "منصفی سے کہہ دو تمھیں اعتبار ہوتا" یعنی غیر تو غیر تم خود بھی اعتبار نہ کرتے۔

مختصر یہ کہ دو مصرعوں میں اتنی نرمیاں موجود ہیں۔ تمھاری طرح تم جھوٹے ہو۔ تم نامنصف ہو۔ تم اعتبار کے قابل نہیں۔
اگر معشوق حقیقتاً نازک دل اور نازک مزاج ہوتا اور کسی سچے اور مہذب عاشق کو یہی ضرورت پیش آتی تو وہ یوں کہتا ہے

ہر سچ ہاں یوں ہیں جو ہم سے کوئی ایسے وعدے کرتا تمھیں اپنے دل میں سوچو تمھیں کیا خیال ہوتا

ایسوں سے شکایت یوں کی جاتی ہے واقف ملتانی کہتا ہے ؎

مکدر گرنہ گردی با تو گویم   کہ با مشت غبار من چہ کردی

کہا تھا بے وفا اک روز میں نے
ستمگر نے شکایت عمر بھر کی
سراج لکھنوی

اگرچہ آخری شعر مذاق عاشقان صادق میں پست مرتبہ کا ہے مگر معشوقان نازک مزاج کے ایک انداز کا آئینہ دار ضرور ہے۔ میں نے اس شعر کو پست بتایا ہے اُس کا سبب یہ ہے کہ اپنی اس بے محابا جرأت پر کہ معشوق کو بے وفا کہدیا عاشق کو عمر بھر کے بعد ندامت نہیں بلکہ اب دوسرا گناہ کرتا ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ سنگین ہے یعنی معشوق کو ستمگر کہتا ہے۔

اتنا کہدینے کے بعد اہل ذوق وارباب نظر کے لئے کچھ اور بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی مگر حقیقت میں سمجھانا اُن کو ہے جو اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھتے جب تک کافی توضیح نہ کیجائے (طلبہ اور عوام) اسلئے اپنی دی ہوئی مثال کے متعلق کچھ کہنا ضروری نظر آتا ہے۔

مصرع اول شروع ہوتا ہے "مری جان" سے اور ماہر نفسیات جانتا ہے کہ سخت بات کہنے میں ایسے الفاظ اور ایسا انداز اختیار کرنا چاہیئے کہ مفہوم کلام کی کراہت قلب سامع کو زیادہ تکلیف نہ دے اور یہی سبب ہے کہ آغاز کلام "مری جان" سے کیا گیا ہے جس سے زیادہ پیار اور محبت کا اظہار کسی اور لفظ سے مشکل نظر آتا ہے تاکہ

سننے والا سمجھ لے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے بمقتضائے محبت کہا جا رہا ہے۔ یہ ملامت گر کی ملامت ہے نہ واعظ کا وعظ نہ رندوں اور آزادوں کی پھبتی نہ غیروں یا دشمنوں کا آوازہ بلکہ یہ بات وہ شخص کہہ رہا ہے جو تم کو اپنی جان کے برابر ہی نہیں بلکہ اپنی جان سمجھتا ہے۔

پہلے شعر میں جو مفہوم "تمھاری طرح" کے ٹکڑے میں ادا کیا گیا ہے وہ دوسرے شعر میں صرف "یوں ہیں" کہکر ادا کر دیا گیا ہے اور یہ بات مؤلف علام کو زیادہ پسند آئے گی اس لئے کہ وہ اختصار کے شیدائی ہیں دوسرا فرق جو اسی ٹکڑے سے پیدا ہو گیا ہے نازک ہے اور زیادہ نازک اور وہ یہ ہے کہ "تمھاری طرح" سے صرف اتنا مفہوم نکلتا ہے کہ معشوق برابر وعدہ خلافیاں کرتا چلا آتا ہے ایک دن عاشق نے اس سے شکایت کی جو شعر میں مذکور ہے۔ مگر "یوں ہیں" کی لفظ میں یہ سب باتیں شامل ہیں اور اسقدر مستزاد ہے کہ اس وقت بھی معشوق نے کوئی ایسی بات کہی ہے جس پر "یوں ہیں" کہا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب کسی ایسے موقع پر کوئی بات کہی جاتی ہے جب مخاطب سے کوئی ایسی ہی بات ظہور میں آئی ہو تو وہ زیادہ متاثر ہوتا ہے ورنہ درصورت انکار واقعات یاد دلانے پڑتے ہیں کبھی حریف اُن کا اقبال کرتا ہے کبھی انکار۔

یہ "تمھاری طرح" ہر شخص جانتا ہے کہ صحت لفظی و معنوی کے اعتبار سے "طَرَح" بحرکت راے مہملہ اور "طَرْح" بسکون راے غیر منقوطہ

مین کوئی فرق نہین مگر رازداران ادب جانتے ہین کہ صرف صحت لفظی اور ہے اور فصاحت اور "طرح کہنے مین " "کچھ ادھل سی جاتی ہے اور وہ لطافت و شیرینی اُس مین نہین رہتی جو طرح مین ہے اور کسی کو رام کرنے مین وہ الفاظ جادو کا اثر رکھتے ہین جن مین نرمی روانی اور شیرینی ہو۔

۵ "تم سے" کہا جا سکتا ہے کہ "تم سے" شعر اول مین بھی تھا اور شعر آخر مین بھی ہے، وہان کیون بے محل تھا یہان کیون برمحل ہے اس کا جواب صاف ہے وہان یہ ٹکڑا "تمھاری طرح" کے بعد واقع ہوا تھا۔ اور یہان "مرے جان یہ ہین" کے نرم و لطیف و محبت خیز ٹکڑے کے بعد واقع ہوا ہے۔ اور "مرے جان" کی لطافت اور پیار نے تم کے سوا آپ اور جناب کی گنجایش ہی نہین رکھی یہان یہ باتین پیار اور محبت کی ہین اور وہان شکایت تھی اور وہ بھی درشت لہجے مین۔

۶۔ کوئی ایسے وعدے کرتا۔ ایسے کی بلاغت قابل دید و قابل داد ہے اس لئے کہ معشوق جس کی وعدہ خلافیون کی شکایت کرنا مقصود ہے بلکہ جس کے اس طرز عمل کی اصلاح منظور ہے وہ خود بھی خوب جانتا ہے کہ وہ کیسے وعدے کرتا ہے جھوٹے یا سچے اس لئے اگر اس کا دل ہی دکھانا مطلوب ہو جو شان عاشقی کے خلاف ہے تو عاشق کو اختیار ہے جو چاہے کہے ورنہ حقیقت یہ ہے جھوٹے وعدے کرنے والے نازک مزاج و نازک دل معشوق سے ایسے وعدے سے زیادہ بلیغ

مہذب اور آمادہ رحم کرنے والے لفظ غالباً اس محل کے لئے خلق ہی نہیں ہوئے اور اس شکایت کے مرتبے معشوق نازک دل و نازک مزاج ہی اٹھائے گا کہ ظالم نے ملامت بھی کی تو کس دلکش اور پیارے انداز سے اور عاشق کی مرتبہ دانی نکتہ سنجی اور موقع شناسی پر اس کی طبیعت بے اختیار مائل ہوگی اور اس کا میلان ہی شہاے آرزو سے تاثر کو

۷- "تمھیں اپنے دل میں سوچو" یہ فقرہ احساسات ظاہر کر رہا ہے کہ عاشق معشوق کو نا منصف نہیں کہتا بلکہ یہ کہتا ہے کہ تمھارے اپنے وعدے خدا ناکردہ میرا دل دکھانے یا مجھے محروم رکھنے کے لئے نہیں ہیں نہ اس وجہ سے ہیں کہ تم ترے انصاف نہیں رکھتے بلکہ تمھارا یہ برتاؤ بے خیالی اور متوجہ نہ ہونے کی وجہ سے ہے ورنہ تم جھوٹے نہیں وعدہ خلاف نہیں نا منصف نہیں دل آزار نہیں بات اتنی ہے کہ تمکو ان امور پر غور کرنے کا خیال ہی نہیں آیا موقع ہی نہیں ملا ورنہ تم اور ایسا کرتے معاذ اللہ۔

۸- "تمھیں کیا خیال ہوتا" کہا یہی کہ تم کو خود اپنے وعدوں پر اعتبار نہ آتا مگر اس دل آویز انداز سے کہ اپنے شاید وہ خود اسے جھوٹا کہنے کی جرأت نہیں کرتا بلکہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا اس لئے کہ وہ خود سمجھا جانتا ہے کہ اس عبارت کا مفہوم کیا ہے۔

دفع دخل۔ کہا جا سکتا ہے کہ مؤلف کے پیش کردہ شعر کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ حقیقت میں مرزا داغ علیہ الرحمہ سے کہا گیا ہے

مگر مین عرض کرونگا نہین ایسا نہین ہے اس لئے کہ ہر عاشق کا فرض یہ ہے کہ اپنے معشوق کے عادات و شمائل طرز بود و ماند اداب و اخلاق سے، واقف ہو اور جانتا ہو کہ معشوق نازک مزاج ہے یا بھولا بالا بلند فطرت ہے یا پست فطرت عالی خاندان ہے یا مجہول النسب عصمت مآب ہے یا عصمت فروش تربیت شریفانہ پائی ہے یا نہین بد مزاج ہے یا خوش مزاج تاکہ اُس کی حماقت سے بنا بنایا کھیل بگڑنے نہ پائے اس لئے حضرت داغ مرحوم نے جس محل پر کہا ہے برمحل کہا ہے ہان اگر حضرت اسے مرحوم کا دعویٰ ہوتا کہ یہ شعر نازک دل نازک مزاج معشوق سے وعدہ خلافین کی شکایت کے محل پر کہا گیا ہے تو بیشک آن کی خدمت مین بھی وہی عرض کیا جاتا جو ہماری شاعری کے مؤلف کی خدمت عالی مین عرض کیا گیا

آخر مین کہنا ہی پڑتا ہے کہ ارباب نظر دیکھین کہ ہمارے جناب ادیب کہان تک ادب آشنا ہین۔

آخری اشاعت

ہماری شاعری کا مقدمہ صفحہ ۴۸

ارشاد حضرت ادیب (۴) "اختصار یعنی کم سے کم لفظون مین مطلب ادا کیا جائے اور ضرورت سے زیادہ بات کو طول نہ دیا جائے اگر طول مناسب مقام ہو طول فضول نہ ہو تو وہ اختصار کے منافی نہیں ہے اختصار سے یہ مطلب ہے کہ کوئی لفظ اور کوئی فقرہ بے ضرورت اور

بیکار استعمال نہ کیا جائے۔

اختصار کی جو تعریف یہاں کی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے
کہ یہ لفظ "ایجاز" کی قدیم اصطلاح کا مرادف نہیں ہے ایجاز ہو یا
اطناب یا مساوات اگر مقتضائے مقام کے موافق ہوگا تو اختصار کے
تحت میں آجائے گا۔

ذیل کی مثالوں سے واضح ہو جائے گا کہ جتنا مطلب کسی عبارت
میں ادا کیا گیا ہے اُتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ اُس عبارت میں سے
کچھ لفظ نکال ڈالنے کے بعد بھی ادا ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم
ہو جائے گا کہ اختصار سے کلام کا اثر بڑھ جاتا ہے۔"

التماس ہجو د۔ اس وقت مصنف علام کی وہ حالت نظر
آتی ہے جو مرض کے بحران اور مادہ کے ہیجان میں ہوتی ہے
ہیجانی دیکھئے کہ اختصار کے سمجھانے میں کس قدر طول دیا
جا رہا ہے ملاحظہ ہو۔

"اختصار یعنی کم سے کم لفظوں میں مطلب ادا کیا جائے" دل
کی بات سمجھا دینے کے لئے یہی ایک جملہ کافی تھا پھر بھی دوسرا فقرہ
آتا ہے "اور ضرورت سے زیادہ بات کو طول نہ دیا جائے" اور ظاہر
ہے کہ یہ جملہ پہلے جملے سے کچھ زیادہ نہیں سمجھاتا۔ اگر طول مناسب
مقام ہو، اتنا ہی ٹکڑا کافی تھا اس پر یہ ٹکڑا مستزاد کیا جاتا ہے
"طول فضول نہ ہو"۔ یہاں تک بھی غنیمت ہے بدل انشا پرداز

کی تسکین نہیں ہوتی اب یہ لکھا جاتا ہے۔ اختصار سے یہ مطلب ہے کہ کوئی لفظ اور کوئی فقرہ بے ضرورت اور بیکار استعمال نہ کیا جائے لفظ فقرہ کا جزو ہوتا ہے اس سے کوئی فقرہ بلکہ کوئی لفظ کہنے کا محل تھا جہاں یہ الٹی گنگا بہائی گئی ہے اگر فقرہ کے بعد لفظ کی لفظ آتی تو تاکید اور زور کلام کا فائدہ دیتی مگر یہاں یہ بات کبھی نہ پیدا ہوتی ہے کے آخر یہ وہ بے ضرورت کے بعد بیکار لکھنا بھی تحصیل حاصل ہے۔ اور منافی اختصار۔

"ہماری شاعری" جب اول مرتبہ شائع ہوئی تھی تو اس میں اختصار کے متعلق اتنی ہی عبارت صفحہ ۳۰ میں تھی جتنی "یعنی کم سے کم لفظوں سے شروع ہو کر بے ضرورت اور بے کار استعمال نہ کیا جائے" پہ ختم ہوتی تھی اس پر کسی اللہ کے بندہ نے یہ اعتراض کیا تھا کہ حضرت اختصار کی دھن میں ایجاز۔ مساوات۔ اطناب کے گلے پہ چھری پھر گئی۔ آخری اشاعت میں مصنف علام نے اس کا جواب ان لفظوں میں دیا ہے۔

اختصار کی جو تعریف یہاں بیان کی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لفظ ایجاز کی قدیم اصطلاح کا مرادف نہیں ہے۔ ایجاز ہو یا اطناب یا مساوات (کیسی صحیح اور بامحاورہ اردو ہے) اگر مقتضائے مقام کے موافق ہوگا تو اختصار کے منافی نہیں ۔۔۔

۔۔۔ اس کے متعلق یہ عرض کرتا ہے کہ جب بلاغت[؟] ان تمام باتوں کیلئے

پہلے ہی۔ اصطلاحین معین فرما دی ہین تو اس زحمت فرمائی کا مآل
سمجھ مین نہین آتا اتنے لفظ پہلے سے مشہور چلے آتے ہین۔

کلام جامع و مانع۔ جس مین کوئی ضروری جزو چھوٹ نہ جائے
اور کوئی غیر ضروری جزو بڑھ نہ جائے فضول الفاظ کے لئے حشویات و
زوائد۔ کلام مختصر کے لئے ایجاز۔ کلام طولانی کے لئے اطناب۔ کلام متوسط
کے لئے مساوات۔ ایجاد اصطلاح کی ضرورت اسوقت پیش آتی
ہے جب پہلے سے کوئی لفظ ان مطالب کے ادا کرنے کے لئے موجود نہو
اس لئے یہ ایجاد غیر ضروری ہے۔ اور لا مشاحۃ فی الاصطلاح کی سپر یہان
آڑے آتی نظر نہین آتی +

اب ہم مؤلف بدل کی ان مثالون کی طرف متوجہ ہوتے ہین
جو اس دعوے کے ثبوت مین پیش کی گئی ہین۔

اشاعت آخر

ہماری شاعری کا مقدمہ صفحہ ۴۸ و ۴۹

ارشاد حضرت ادیب۔ "ذیل کی مثالون سے واضح ہوجائے گا
کہ جتنا مطلب کسی عبارت مین ادا کیا گیا ہے اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ
اس عبارت سے کچھ لفظ نکال ڈالنے پر بھی ادا ہو سکتا ہے اور یہ بھی
معلوم ہوجائے گا کہ اختصار سے کلام کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ پہلی مثال
مرزا دبیر مغفور کی ایک رباعی ہے۔

نادان کہوں دل کو کہ خردمند کہوں　　یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
دیکھ اک روز خدا کو منہ دکھانا ہے پھر　　بندوں کو میں کس منہ سے خداوند کہوں

کسی نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے :-

دل کو نادان کہوں یا وضع کا پابند کہوں
مجھ سے ہوتا نہیں بندوں کو خداوند کہوں

" اس شعر کے پہلے مصرع میں اوپر کی رباعی کے پہلے دو مصرعوں کا مضمون پورا سما گیا ہے اور ہر حیثیت سے یہ شعر خوبی روانی اور اثر میں اس رباعی سے کس قدر بڑھ گیا ہے یہ زیادہ تر اختصار کلام ہی کا نتیجہ ہے "

التماس مجوز - اس میں تو شک نہیں کہ اختصار بھی کلام کی ایک خوبی ہے مگر ایسی حالت میں جب کہ جو کچھ کہنا ہے سب مختصر لفظوں میں خوبصورتی سے کہہ دیا جائے - دیکھنے کی بات یہ ہے (یہاں مثال میں ایک تو رباعی ہے جس میں چار مصرعوں کا پڑھنا ضروری ہے اور وہاں صرف ایک شعر ہے اور وہ بھی جس بحر میں ہے وہ ایسی ہے کہ اس میں اتنے ہی کم لفظ سما سکتے ہیں اس لئے یہ تقابل صحیح . . . . . ہر اک شخص اوزان رباعی سے واقف ہے وہ اس رباعی میں جناب مؤلف کے پیش کردہ شعر سے کہیں زیادہ خوبصورتی روانی برجستگی لطف زبان حسن محاورہ چستی بندش تاثیر اور صفا پہنچنے کیا پایا ہے اور اضافی مستزاد ہیں۔ یہ رباعی سے آگے ہو گئے ۔ صحیح کا لانا آج

جناب دبیر کی رباعی ایک مسلسل داستان ہے اور خیال کی سیر کا دلکش مرقع۔ اور مؤلف کا پیش کردہ شعر اُس کا ایک جزو ناقص نظر آتا ہے میں پہلے مؤلف کے پیش کردہ شعر کی توضیح کردوں تاکہ رباعی دبیر کی توضیح خود ہی دونوں کا فرق ظاہر کردے۔

شعر مؤلف کی توضیح۔ اگرچہ دنیا والوں کی دیکھا دیکھی میرا بھی جی چاہتا ہے کہ بندوں کو خداوند کہوں اُن کی خوشنودی حاصل کروں نفع اٹھاؤں اپنی عزت بڑھاؤں مگر کیا کروں اپنے دل سے مجبور ہوں مجھ سے تو بندوں کو خداوند نہیں کہا جاتا اب چاہئے اسے میرے دل کی حماقت سمجھو یا سے وضع کی پابندی کہہ لو سچ یوں کہیں اپنی فطرت سے مجبور ہوں اس کا بدلنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مجھ سے ہوتا نہیں کا ٹکڑا بہت ہی خوبصورت ہے مگر دبیر کی ہاں میں کیسی منجھے سے کا ٹکڑا اس کا بدل ہو چکا ہے

توضیح رباعی دبیر

نادان کہوں دل کو کہ خردمند کہوں پا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک روز خدا کو منہ دکھانا ہے دبیر کس منہ سے میں بندوں کو خداوند کہوں

ایک شخص ہے کہ چند دن کے لئے سرکار اور خداوند کے الفاظ اس کی زبان سے نہیں نکلے اور اس کے دنیوی مفاد میں خلل پڑتا ہے اس لئے کہ خوشامد پسندی اکثر صاحبان جاہ کی گویا سرشت ہو جایا کرتی ہے وہ حیران ہے اور سوچ رہا ہے کہ آخر حقیقت کیا ہے میرا دل نادان ہے

یا عقلمند یعنی ایسا کرنے مین حق بجانب ہے یا غلط کار اب سلسلۂ
خیال آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے ممکن ہے کہ میرے دل کے اس فعل
کا تعلق نہ دانائی سے ہو نہ نادانی سے بلکہ زنجیر وضع مین جکڑے ہوئے
کے سبب سے ہو مگر تسکین قلب نہین ہوتی خیال کچھ اور آگے بڑھتا ہے
اور سوچتے سوچتے حقیقت پردہ فگن ہوتی ہے اور اصل راز اسکی
سمجھ مین آتا ہے اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے اچھا اب مین سمجھا
میرے دل کا یہ فعل وحدانیت صحیح کی بنا پر ہے اور اس کی شرح
یہ ہے کہ ایک دن (روز قیامت) خدا کا سامنا کرنا ہے جس کے سوا
نہ کوئی خداوند ہے نہ اس جلیل القدر نام سے پکارے جانے کے قابل
ہے مین بندون کو خداوند کہنے کی جرأت کہان سے لاؤن۔ مختصر یہ کہ
اس شعر مین اتنے عالمون کا ذکر ہے۔ عالم حیرت سوال کا پیدا ہونا
خیال کا غیر واقعی اسباب کو اسباب حقیقی سمجھنا۔ کبھی اپنے اس فعل
کو نادانی کی کارفرمائی جاننا کبھی دانائی کی کرشمہ سازی گرداننا۔ پھر
وضعداری کی طرف خیال کا جانا۔ پھر دلیل کا قائم ہونا اور اس کے
بعد اصل حقیقت کا ذہن مین آنا جس پر انشراح خاطر ہونا ضروری
ہے آخر مین دل کے اس فعل کو وحدانیت کی معجزہ آرائی کا نتیجہ پانا
یعنی یہ سمجھنا کہ دل کا اس امر سے ابا کرنا بمقتضائے فطرت عالیہ ہے
اور یہ وہ مقام ہے جہان اہل دل کے لئے سجدۂ شکر مین گرنا واجب
ہو جاتا ہے۔

نادان کہوں انکو کہ خردمند کہوں — یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک روز خدا کو منہ دکھانا ہے دبیر — کس منہ سے میں بندوں کو خداوند کہوں

شاعر کا خیال اسوقت عالم حیرت کی سیر کر رہا ہے اب اسی عالم کی دوسری منزل کا تماشائی ہے اب دلیل قائم ہوتی ہے اور اصل راز منکشف ہوتا ہے اب آخری فیصلہ ہوتا ہے اور شاعر اپنے فعل کو محدود سمجھتا ہے۔

معنوی خوبیاں مختصراً بیان کیجا چکیں اب لفظی خوبیاں مجملاً دکھائی جاتی ہیں "نادان" و "خردمند" میں صنعت تضاد ہے "سلسلہ" و "پابند" میں مراعات النظیر ہے "خدا کو منہ دکھانا" اور "کس منہ سے" وہ الفاظ جمع ہو گئے ہیں کہ مذاق سلیم وجد کرتا ہے اس لئے کہ ان الفاظ کے جمع ہونے میں تکلف و تصنع کو دخل نہیں۔

دوسرے شاعر نے خردمند کا ٹکڑا اڑا دیا اور یہ نہ سمجھا کہ اس میں اتنے معنی پوشیدہ تھے کہ ابھی تک متکلم خود اپنے فعل کو نادانی سمجھ سکا ہے نہ دانائی اور عالم حیرت کے نظاروں میں سے یہ نظارہ حذف ہو گیا صرف نادان کہوں اور پابندی وضع کے ٹکڑے اپنے مصرع میں جوڑ سکے بگڑی جو کچھ مولف کے پیش کردہ شعر میں رہ گیا ہے وہ جناب دبیر کی رباعی کی کرامت ہے اس لئے کہ یہ شعر اگرچہ ناقص ہے مگر ہے اسی رباعی کا خلاصہ سچ کہا ہے کہنے والے نے الولد سر لابیہ اسوقت جناب دبیر کی روح یہ کہتی ہے

تم نے سودا کئے نہیں قتل کیا کئے ہیں
یہ اگر سچ ہے تو احسان اٹھا کیا کئے ہیں

ہماری شاعری کا مقصد آخری اشاعت صفحہ ۲۹

ارشاد جناب ادیب "دوسری مثال۔ خدائے سخن میر تقی میر کا ایک شعر ہے

میر

بیکسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پر
جو ہماری خاک پر سے ہو کے گذرا رو گیا

اس شعر کو مختصر کر کے یوں بھی پڑھ سکتے ہیں ۔

بیکسی برسا کی اپنی گور پر
جو ادھر سے ہو کے گذرا رو گیا

دونوں مصرعوں سے کچھ الفاظ کم کر دیے گئے مگر معنی میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ کچھ زیادتی ہو گئی "مدت تلک" سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اب بیکسی نہیں رہی ان لفظوں کو نکال ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والے نے صرف گذشتہ زمانے کے بارے میں اپنا خبر دی ہے اور زمانۂ حال کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ اس لئے کوئی چیز نہیں اس خیال سے نہیں روکتی کہ اب بھی بیکسی برس رہی ہے"

التماس مجیب۔ اس مقام پر جناب ادیب نے ایسی ستم ظریفی کی ہے کہ اس کی داد دینا اتنا دشوار ہے آپ نے میر علیہ الرحمہ کے نام کے ساتھ اُن کا مشہور خطاب لکھ دیا ہے یعنی خدائے سخن پھر ایسی بندگی کو معراج پر پہونچانے کے لئے اسی خدا کے کلام میں اصلاح بھی فرمادی سبحان اور کرنا بھی یہی چاہیے تھا اب وہ زمانہ کہاں ہے جب کہ بندے خدا کی خدائی پر ایمان لاتے ہی اسکے کلام پر اعتراض کرنا شان بندگی کے

خلاف سمجھتے تھے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس بندۂ معصوم اس
بھولے بھالے نقاد کو یہ خبر نہیں کہ اُستاد "خدائے سخن" کی جناب
میں کیسی گستاخی اور دریدہ دہنی کی ہے اس یہ ہے کہ ارشاد ہو رہا
ہے کہ کچھ الفاظ کم کر دینے سے معنی میں کوئی کمی نہیں ہوتی بلکہ کچھ
اور زیادتی ہوتی ہے اس کے معنی تو یہی ٹھہرے کہ میر کے شعر میں اتنے
الفاظ بیکار رکھے گئے تھے جنہیں اصطلاح میں حشو یا حشو زوائد یہ
کہتے ہیں جب یہ الفاظ ضرورت سے زائد تھے تو ان کا عبث ہونا
ظاہر ہے کسی کو خدا کہنا (وہ مجازاً ہی سہی) اور ساتھ ہی ساتھ
اُس کے نقص کی طرف اشارہ کرنا دانشمندانہ فعل نہیں۔ حالانکہ
حقیقت اس کے خلاف ہے الفاظ کے کم کر دینے سے معانی و
لطافت شعر میں کھلی کھلی کمی ہو گئی ہے یہاں جناب ادیب کو اپنا وہ
ارشاد یاد نہیں رہا جو ہماری شاعری (آخری اشاعت) کے صفحہ ۵۵
پہ ان لفظوں میں نظر آتا ہے:-

ارشاد حضرت ادیب "بعض وقت یہ بھی ہوتا ہے کہ کئی لفظ ایک
ہی چیز پر دلالت کرتے ہیں مگر ان لفظوں کے لغوی معنی یکساں
نہیں ہوتے اس لیے اُس کا اثر بھی یکساں نہیں ہوتا مثلاً رزاق،
قہار، غفار، خلاق، ان سب لفظوں سے مراد خدا ہی ہے۔ مگر
ہر لفظ سے خدا کی ایک خاص صفت ظاہر ہوتی ہے اس لیے
اُن لفظوں کو استعمال کرتے وقت مناسبت مقام کا لحاظ رکھنا

ضروری ہے اگر خدا سے رزق مانگنا ہو تو رزاق کہکر پکارئیے ۔ الخ
التماس بیخود ۔ مختصر یہ کہ شعر کی اصلاح فرمائی تھی تو میر کو خدائے سخن
کے بجائے کسی ایسے خطاب سے یاد کرنا تھا جو مناسب مقام ہوتا

اس شعر میں ۔
بیکسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پہ   جو ہماری خاک پر سے ہو کے گذرا رو گیا
بقول مؤلف دو ٹکڑے زائد تھے ۔ مدت تلک ۔ اور ہماری خاک ۔

مولف علام کی ترمیم سے شعر کے معنی یہ ہو گئے کہ ہماری گور پہ ہمیشہ
بیکسی برستی رہی اور جو اس طرف سے ہو کے گذرا وہ رو دیا ضرور دا ویہی
اضافہ معنی ہے سبحان اللہ سبحان اللہ کیا کہنا ۔ یہ سخن فہمی عالم بالا معلوم شد
کہنے کا محل ہے مصنف شعر (میر تقی) یہ نہیں کہتا بلکہ کچھ اور کہتا ہے
وہ یہ کہ ایک زمانہ دراز تک ہماری قبر پر بیکسی برستی رہی اس کے بعد
کے زمانے کا حال لفظاً کچھ بیان نہیں کرتا مگر یہ ٹکڑا ہے معنی خیز اور
بتا رہا ہے کہ ایک مدت تک یہ عالم رہا یعنی بیکسی برستی رہی اور اب نہیں
برستی اس لئے کہ اب نہ قبر باقی ہے نہ نشان قبر بیکسی برسے تو
کس پہ برسے "مدت تلک" کا ٹکڑا واقعیت سے دست و گریبان ہے
اور صرف برسا کی میں ہمیشگی کی شان نکلتی ہے جو بیکسی کے خلاف ہے
واقعہ کے خلاف ہے قیاس کے خلاف ہے وہ یوں کہ جس قبر کا کوئی
پرسان نہ ہو وہ ایک زمانہ تک رہنے کی پھر قبر کیسی نشان قبر بھی نہ رہیگا
تاکہ ادھر سے کوئی سڑک نہ نکلی کوئی بستی وہاں نہ بسی زراعت نہ ہوئی

مردے کی ہڈیان نکال کر کوئی اور لاش نہ دفن کی گئی پھر بھی انقلابات
عالم و مقتضیات فطرت کو کون مانع ہے اُس مین دھوپ سے دراڑین
پڑینگی کیڑے اُسے چھلنی کرینگے حشرات الارض اُسے اپنا مسکن
بنائینگے مینھ کے تیر اُس پر برسینگے سیل اُدھر آئیگی پانی
اُس مین بھرے گا زلزلے اُسے کروٹ بدلوائینگے آندھیان اُسے
اُڑائینگی راہگیر اُسے پامال کرینگے جب کوئی خبر لینے والا ہی نہین
تو ایک مدت بعد اس عبرت خیز منظر پر فنا کا پردہ گرے گا حضرت میر بھی
فرماتے ہین کہ جب تک قبر رہی اُس پر بیکسی برستی رہی ایک مدت بعد قبر
ہی نہ رہی اور رہی تو آل انتہائے بیکسی ہے مختصر یہ کہ
رت تلک کے ٹکڑے سے اُس زمانہ دراز کا گریہ خیز و عبرت انگیز
منظر آنکھون مین پھرنے لگا۔ خیال۔ انداز بیان۔ انتخاب الفاظ سب مطابق
مقتضا ہین۔ پہلے مصرعہ مین "گور" قبر کے معنی کا ایک عام لفظ رکھا تھا دوسرے
مصرع مین بیان کو زیادہ موثر و دلگداز بنانے کے لیے "ہماری خاک" کہا
یہ حشو کہنا سخن سنجی کے گلے پر چھری پھیرنا ہے مین اپنے مفہوم کو زیادہ
واضح کرنے کے لیے یہ بھی کہے دیتا ہون کہ بیکسی اُن کی قبرون پر برستی
ہے جنکے چاہنے والے اور خاندان نیست و نابود ہو جاتے ہین یا جن کے
عزیز و احبا ایسے نااہل ہوتے ہین کہ جس دن سے دفن کر آئے اُدھر
پلٹ کر بھی نہ دیکھا اور قبر ایک مٹی کے چراغ اور چار پھولون کو ترسا کی فاتحہ خوان کا
گذر نہ ہوا پھر قرآن خوانی و مجلس عزا و میلاد کا کیا ذکر ہے قبر مین

شکستگی کے آثار پیدا ہوئے تو کسی نے خبر لی، بیل بیا لگی تو کسی کو
پروا نہ ہوئی ایک دن قبر پہ چڑھا اور روندی گئی پھر عرس کہاں کا اور دیا ور
کس کی۔ اس کا انجام کیا ہے قبر کا مٹ جانا ایسی قبریں بالعموم نشان سے
ہٹتی ہیں اور پختہ بھی ہوں تو کب تک رہیں گی طاق کسریٰ تو کھنڈر ہو کے
رہ گیا پھر معمولی قبروں کی کیا بساط ہے اس وقت میر کی روح زبانِ
عالم سے یہ کہہ رہی ہے ؎

کس ما نگہ ہیچ نفہمیدہ اند در ہمہ عمر
عیب جوئی من جملہ نکتہ دان شدہ اند

۳۰۔ اب دوسرے ٹکڑے پر نظر فرمائیے یعنی جو ہماری خاک پر سے ہو کے
گذرا رہ گیا یہاں خاک قبر کے معنوں میں ہے اس میں پہلی بات تو یہ داد کے
قابل ہے کہ مصنف نے گور کا لفظ دوبارہ استعمال نہیں کیا دوسری بات
یہ ہے کہ قبر۔ مقبرہ۔ مزار میں سے کوئی لفظ نہیں رکھا اور یہ انتہائی بلاغت
ہے اور انتخاب الفاظ کی معراج یعنی کوئی لفظ ایسا نہیں رکھا جس میں
شان نکلتی ہو بلکہ پہلے مصرع میں گور کہا اور دوسرے میں "ہماری خاک"
تاکہ بیکسی میں کچھ اور اضافہ نظر آئے اس لفظ سے کس مپرسی کی کیفیت
کچھ اور بڑھ گئی تصویر کھینچ دی بیکسی اور اداسی سب کا مرقع صرف "ہماری خاک"
کہکر دکھا دیا، خاک یعنی قبر اس محل پر ایسا لفظ ہے جو اپنے معانی کی
تصویر ہے اور اہل فن جانتے ہیں کہ ایسے لفظ رکھ دینا جن میں اپنے مفہوم
کی تصویر بھی ہو زیادہ اثر رکھتا ہے جیسے جالے ڈالدیئے [illegible]

(سر کے گرنے کی جگہ) اس لیے کہ اکثر بچہ سر کے بل ہی پیدا ہوتا ہے۔ اسکے سوا بحر بھی طولانی۔ میر نے پہلے مصرع میں "دست تاک" اور دوسرے مصرع میں "جو ہماری خاک پر" کے ٹکڑے رکھکر حشو اس قدر بھرتی کے بھردیا ہے کہ بے اختیار واہ نکل جاتی ہے۔ کاش مؤلف کتاب اُن کے عام مسائل ہی سے واقف ہوتا۔

ہماری شاعری کا مقدمہ آخری اشاعت صفحہ ۴۹

ارشاد ہوتا ہے "تیسری مثال نظیر کا ایک قطعہ ہے"

اک دن اک استخوان پہ جا پڑا میرا جو پاؤں
کیا کہوں اُس وقت میرے دل میں کیا کیا دھیان تھے
پاؤں پڑتے ہی غرض اس استخوان نے آہ کی
اور کہا ظالم کبھی ہم بھی تو رکھتے جان تھے
دست و پا، زانو، سر و گردن، شکم، پشت و کمر
دیکھنے کو آنکھ اور سننے کے خاطر کان تھے
ابرو بینی جبین نقش و نگار و خال و خط
لعل و مروارید سے بہتر لب و دندان تھے
رات کو سونے کو کیا کیا نرم و نازک تھے پلنگ
دن کو خاطر بیٹھنے کے تخت اور ایوان تھے
ایک ہی جھٹکا اجل نے آن کر ایسا دیا

پھر نہ تو ہم تھے نہ وہ سب عیش کے سامان تھے
ایسی بے رحمی سے مت رکھو پاؤں ہم پہ اے نظیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

اب اس کے مقابلہ میں میر کا قطعہ دیکھئے۔

قطعہ

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا — یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

دونوں شاعروں نے ایک ہی طرح کا واقعہ بیان کیا ہے اور ایک ہی اثر لیا ہے مگر جو زور اور جتنا اثر میر نے دونوں شعروں میں بھر دیا ہے اس کا عشر عشیر بھی نظیر کے سات شعروں میں نہ سما سکا اس کے اور اسباب بھی ہوں گے لیکن خاص سبب یہی ہے کہ میر نے اختصار سے کام لیا اور نظیر نے بیکار طول دیا۔ نظیر بھی اگر اختصار پر نظر رکھتے تو ان کے قطعہ میں بھی اثر کا ایک عالم ہوتا۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ اگر ان کے قطعے سے شروع کے دو شعر اور آخر کا ایک شعر لے لیا جائے اور درمیان کے چار شعر نکال دیے جائیں تو یہ قطعہ بن جاتا ہے۔

قطعہ

ایک دن اک استخوان پر جا پڑا میرا جو پاؤں
کیا کہوں اس وقت میرے دل میں کیا کیا دھیان تھے
پاؤں پڑتے ہی غرض اس استخوان نے آہ کی

اور کہا ظالم کبھی ہم بھی تو رکھتے جان تھے

ایسی بے رحمی سے مت رکھ پاؤں ہم پر اے فقیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

"اب اس مختصر قطعہ کا اُن کے اصل قطعہ سے مقابلہ کیجئے اور دیکھئے کہ اختصار سے کلام میں اثر کیونکر پیدا ہو جاتا ہے"

التماس بیخود - اللہ اکبر اس حسن بیرو سے نیاز یاں ہم مؤلف کتاب کی خاطر سے بیخود بیرو کے لئے مانے لیتے ہیں کہ نظیر کے قطعے بہت پر اشعار سست ہیں مگر اس سے یہ نتیجہ کون نکال سکتا ہے اور کیونکر نکال سکتا ہے کہ اس کا سبب اشعار کی زیادتی ہے - ہاں اگر ضرورت ہو تو شعر الہند یہ ضرور کہا جا سکتی ہے کہ جب طبیعت مساعدت نہ کرے تو زبردستی شعر نہ کہو اور اگر کہہ بیٹھے ہو تو سست اشعار انتخاب کر لو لیکن اشعار کی سستی اور خوبی کو اختصار کی معجز نمائی سمجھنا دانائی نہیں - قطعہ قصیدہ پانچ پانچ شعر کے ہوتے ہیں مگر ان میں سے ایک شعر بھی نکال ڈالنا آسان نہیں ہوتا - ہم دو مختصر سے قطعے نقل کرتے ہیں اور ہے کوئی جو ان میں سے ایک شعر بھی حذف کر دینے کی قدرت رکھتا ہو -

قطعہ غالب ۔ بے ثباتی عیش دنیا

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامان باغبان و کف گلفروش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

قطعہ ہاتف اصفہانی در باب پابندی ہمت

خارہ بہ ردون بمژگان خارہ شکستن بہ پشت
سنگ خاییدن بہ دندان کوہ ببریدن بہ چنگ

لب بہ دنبال عقرب بوسہ بر دندان مار
پنجہ با چنگال ثعبان عرض در کام نہنگ

از سر پستان شیر شرزہ دوشیدن حلیب
وز بن دندان مار گرزہ نوشیدن شرنگ

تیر غوسے روز بر گردون کشیدن خیز خیز
پیر زالے را بہ بغل شب برگرفتن تنگ تنگ

طعمہ برگردن بہ خشم از کام شیر گرسنہ
صید بگرفتن بہ جبر از پیش غضبان پلنگ

تشنہ کام و پا برہنہ در تموز و سنگلاخ
رہ بریدن بے عصا فرسنگہا با پائے لنگ

نقشہا بستم شگرف از کلکِ موی آب تند
تنہا کردم پدید از خارۂ بیچارہ سنگ

صد رہ آسان تر بود بر من کہ در بزم الم
بادہ نوشم سرخ سرخ و جامہ پوشم رنگ رنگ

چرخ گرد از ہستی من گر بر آرد گو برآر
دور بادا دور از دامان ناکام گرد ننگ

اب ہم ذرا دیر کیلئے مولف علام کی خاطر سے تعلیم کے قطعہ میں چند اشعار بڑھائے دیتے ہیں اور انہیں قافیوں کا التزام رکھتے ہیں۔ ہر استخوان کو کاسۂ [illegible]

قطعہ

ایک دن اک استخوان پہ جا پڑا میرا جو پاؤں
کیا کہوں اس وقت میرے دل پہ کیا کیا دھیان تھے

پاؤں پڑتے ہی غرض اُسنے بھری اک آہ سرد
اور کہا ظالم کبھی ہم بھی تو رکھتے جان تھے

بارہا در پیچ جبین تھی صاعقہ در کف نگاہ
جادو پرور آنکھ تھی اور نغمہ پرور کان تھے

اہل دل کو طور کے جلوے دکھاتی تھی ہنسی
لب حجاب قدس تھے حسن ازل پالان تھے

جگمگاہٹ تخت کی وہ تھی کہ شرماتا تھا مہر
آسمان بھی جن سے شرمندہ تھے وہ ایوان تھے

ایک اک گوشہ تھا گھر کا غیرت باغ ارم
جو تصور میں نہ تیرے آئیں وہ سامان تھے
ایسی بیدردی سے ہم پر پاؤں مت رکھ اے نظیر
آج ایسے ہیں کبھی لیکن خدا کی شان تھے

انکشاف راز یعنی تحقیق مقام

اب اس قطعہ میں جیتی بھی ہے بلندی بھی ہے زور بھی ہے شور بھی ہے اور ہمارے بڑھائے ہوئے اشعار نظیر کے ابتدائی اشعار سے زیادہ رفیع المنزلت نظر آتے ہیں مگر ذوق سلیم کہتا ہے کہ تمام معجزہ آرائیاں یہ تمام قدرت نمائیاں بے محل ہیں اس لئے کہ قطعہ پابند ہے اپنے آخری شعر کا اور وہ شعر اس قطعہ کا یہ ہے ۔
ایسی بیدردی سے ہم پر پاؤں مت رکھ اے نظیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے
شاعر نے آخر میں کہا تو یہ کہا کہ ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے اس لئے ضروری ہے کہ مصرعے ایسے نکالے جائیں کہ قطعہ اس مصرع پر تمام ہو سکے ہم نے سب قافیے بٹھا دیئے مگر جب آخری شعر پر پہونچے تو آخری مصرع بدلے بغیر چارہ نہ ہوا ہمارا دعویٰ ہے کہ نظیر کے قطعہ میں کہیں جھول نہیں اس کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے ۔
ایک دن اک استخوان پر جا پڑا میرا جو پاؤں
کیا کہوں اُس وقت میرے دل میں کیا کیا دھیان تھے
اس شعر میں کہتا ہے کہ میں نے اُس ہڈی پر دیدہ و دانستہ پاؤں نہیں رکھا تھا

بلکہ جاپڑا تھا اس کی وجہ دوسرے مصرع مین بتاتا ہے یعنی اسوقت میرے
دل مین ہزارون خیال تھے اور مین اُنھین مین محو چلا جا رہا تھا کہ یہ واقعہ
پیش آیا۔ دوسرے مصرع مین دو ٹکڑے خصوصیت سے
لحاظ کے قابل ہین اول تو کیا کہون دوسرے کیا کیا دھیان تھے۔ کیا کہون کا
کا مفہوم تو یہ ہے کہ بیکار طول ہوگا یا وہ خیالات ہین جن مین اُلجھا ہوا
تھا قابل اظہار نہین ہین یا بیان مین نہین آسکتے۔ آگے بڑھکر کیا کیا دھیان
تھے کہا ہے یہ ٹکڑا اسقدر معنی خیز ہے کہ انسان کے دل مین جتنے بھی خیال آسکتے
ہین سب اس کی شرح مین لکھے جا سکتے ہین۔

دوسرے شعر مین ہے ؎

پاؤن پڑتے ہی غرض اُس استخوان نے آہ کی
اور کہا ظالم کبھی ہم بھی تو رکھتے جان تھے

بظاہر لفظ غرض بھرتی کا لفظ معلوم ہوتا ہے مگر ایسا نہین ہے کیا کہون
اُسوقت میرے دل مین کیا کیا دھیان تھے یعنی مین اپنے خیالات سے
قطع نظر کرتا ہون اور واقعہ بیان کرتا ہون یعنی خلاصہ کلام یہ ہے کہ پاؤن
پڑتے ہی اُس ہڈی نے ایک آہ کھینچی۔ اور کہا کہ اے ظالم آج یہ حال ہے
مگر کبھی ہمارے بھی جان تھی۔ ابھی تک اُس ہڈی نے صرف یہ کہا ہے کہ
ہم جاندار تھے یہ نہین بتایا کہ حیوانات کے کس طبقے مین سے تھے تیسرے
شعر مین ہے ؎

دست و پا زانو سر و گردن شکم پشت و کمر
دیکھنے کو آنکھ اور سننے کی خاطر کان تھے

اس استخوان کے ٹکڑے میں تنافر کلمات ہے اور البتہ برا معلوم ہوتا ہے
اب رہا میر کا قطعہ اس کے لاجواب ہونے میں جیسے شک ہو
کا فرق ہے اس قطعہ میں بھی خود میر نظر آتے ہیں وہی جلال وہی تمکنت
وہی بانکپن، سوز و گداز نظیر کے قطعہ میں جلوہ گر ہے تو ہیبت و افتخار
میر کے قطعہ میں دیکھئے تا سر

کہتے رکا کہ دیکھ کر چل راہ بے خبر
میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

میں وہی سپاہی کے بگڑے ہوئے تیور ہیں۔ نظیر کے قطعہ میں
نرمی اور نصیحت ہے میر کے قطعہ میں گرمی اور نصیحت میر کے
قطعہ میں غرور کو ٹھیس پہنچنے والی تکلیف کا اظہار ہے اور اپنی اہانت
پر غصہ نظیر کے قطعہ میں پامال ہونے کی تکلیف کا اظہار ہے اور
بیداد روی کا شکوہ۔ رحم کی التجا ہے اس لئے دونوں کا تقابل
لایعنی سی بات ہے علاوہ اس کے میر کا پاؤں پڑا ہے کاسہ سر
پر نظیر کا پاؤں پڑا ہے ایک ہڈی پر خدا جانے کس کی اور کہاں
کی تھی اس لئے اس نے پہلے اپنے کو جاندار بتایا پھر انسان
پھر خوبصورت انسان پھر صاحب جاہ و دولت اور آخر میں کہا
کہ ان سب باتوں سے قطع نظر کرکے صرف اتنا ہی سمجھ لے کہ
ہم تیری طرح انسان تھے اور ہم پر یہ ستم کر۔ ایسی بیداد روی
بھی کیا۔ نظیر نے ابتدا ہی سے یہ کہہ دیا کہ استخوان نے آہ سرد
کھینچی اور پامال کرنے والے کے اس فعل کو بیداد روی اور

بے رحمی سمجھا اُن کو بھول کر بھی یہ خیال نہیں آیا کہ غرور اس کا باعث ہے اور یہیں سے ان کا انداز طبیعت جھلکتا ہے میر کا پاؤں پڑا کاسۂ سر پہ اور اُس سر نے کہا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھی کسی کا سر پُر غرور تھا یعنی یہاں اگرچہ پاؤں کا سر پہ بے ارادہ جا پڑا تھا مگر سمجھا یہ گیا کہ غرور کے سبب سے ٹھکراتا ہوا چلتا ہے اس لئے آگے بڑھ کر کہا ہے میں بھی کبھی کسی کا سر پُر غرور تھا۔ یاد رہے کہ مغرور سے خطاب کا انداز اہل دل کے ہاں اور ہے اور بے درد ظالم سے اور۔ میر کے قطعہ میں ایک بات یہ بھی ہے کہ صاحب سر کی تنک مزاجی کا آئینہ ہے اس لئے کہ جہاں کوئی بات اپنے مزاج والوں کے خلاف گزری اُن کے تلووں سے لگتی ہے میں سمجھتی ہے اور فوراً نہایت تند تلخ بات کہہ اُٹھتے ہیں نظیر کے قطعہ میں جلنا ہے اور میر کے قطعہ میں ایجاز نظیر کے قطعہ میں ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ اُس کو اپنی موجودہ بے بسی اور بے سروپائی کا بھی احساس ہے اس لئے گرمی نہیں کرتا نرمی کرتا ہے۔

ایسی بے رحمی سے ہم پر پاؤں مت رکھ اے نظیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

اس شعر میں یہ ٹکڑے ایسی بے رحمی سے ہم پر پاؤں مت رکھ اے نظیر اور او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے ؎

کس قدر دلگداز اور ترحم انگیز ہیں۔ ماہر نفسیات جانتا ہے کہ
جس نصیحت میں ناصح کے تیور بگڑے ہوئے ہوں وہ دل پر
اثر نہیں کرتی بلکہ ناصح کی طرف سے نفرت بھی پیدا کرتی ہے مگر نظیر نے جو اسکی
پرواہ کی ہے یہ بات میر کے قطعہ میں نہیں ہے۔ نظیر کے قطعہ میں یہ اثر ہے
کہ نفرت کی بجائے انفعال پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ گداز دل
بھی ابھرا اس طرح کی نصیحت کا اثر زیادہ گہرا ہوتا ہے مختصر یہ کہ

مصرع لطیف بود حکایت دراز تر گفتم

ایک بات یہ بھی ہے۔ نظیر نے نہایت ہی نرمی سے اپنا صاحب
تاج و تخت ہونا بیان کیا ہے میر نے صرف سر کو سرِ غرور
[illegible] میر کے قطعہ میں اگر زیادہ اشعار ہوتے تو یہ بات انسانی کا مشکل ہو جاتا۔
نوٹ - میں نے میر کے قطعہ کی زیادہ توضیح نہیں کی۔
اس لئے کہ اس کی خوبی اس کی تاثیر اس کے جوش و خروش
کا اعتراف خود حضرت علامہ نے کیا ہے۔

جناب لطیف کی رائے درست تھا وہ یہ میں کی [illegible]
[illegible] آمد کم جاتی ہے

خسرو [illegible] درد [illegible] ارکستی لغزہ
کرم کرو [illegible]

ہماری شاعری کا مقدمہ اشاعت آخر صفحہ ۳۷

ارشاد ادیب

بلندی خیال کی مثالیں

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

حضرت یاس عظیم آبادی

التماس مجوّد۔ جناب ادیب نے حضرت یاس عظیم آبادی کے اس شعر کو بلندی خیال کی مثالوں میں صفحہ ۳۷ پر جگہ دی ہے اور کسی مستفسر کے استفسار پر ضمیمہ کتاب ہذا صفحہ ۱۷ و ۱۹ سے صفحہ ۲۶ تک اس کی شرح فرمائی ہے جو یہاں نقل کی جاتی ہے اور شعر کی تنقید کر کے دکھایا گیا ہے کہ من چہ سرایم و طنبورہ من چہ می سراید کی اس سے بہتر مثال ملنا مشکل ہے

~~شرح جناب ادیب~~ جناب مؤلف کی دی ہوئی مثالیں زیادہ تر ایسی ہی ہیں یعنی غلط ہیں سقیم ہیں بے محل ہیں ....

شرح جناب ادیب

....

ارشاد ادیب۔ شاعر کا خیال ہے کہ جس کو بخت نارسا نہ ملا وہ بدنصیب ہے۔ ظاہر میں تو یہ ایک اجتماع ضدین معلوم ہوتا ہے مگر نکتہ رس نگاہ کو اسی ظاہری اجتماع ضدین میں ایک نہایت ہی بلند خیال چھپا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ عام لوگوں کے نزدیک بخت کی رسائی خوش نصیبی اور نارسائی ہے کیا؟ اپنی خواہشوں اور ارادوں کا پورا ہونا یا نہ ہونا۔ تو عوام کے معیار کے مطابق خوش نصیب وہ ہے جس کی خواہشوں

اور ارادون کا پورا ہونا یا نہ ہونا۔ تو عوام کے معیار کے مطابق خوش نصیب وہ ہے جس کی خواہشین اور ارادے پورے ہوتے رہین اور بدنصیب وہ ہے جس کی خواہشین اور ارادے پورے نہ ہون لیکن شاعر انسان کے رتبے کی بلندی اور خواہشون اور ارادون کی کم حقیقتی پر نظر کر کے خوش نصیبی اور بدنصیبی کے اس معیار کو بہت پست سمجھتا ہے۔ اُس کے نزدیک خوش نصیبی اور بدنصیبی کا معیار خدا شناسی ہے جو اصل مین مترادف ہے حق شناسی اور حقیقت شناسی کا اور جس سے زیادہ بلند مرتبہ کوئی فضیلت انسان کے لئے ہو نہین سکتی یعنی خدا شناسی کی فضیلت جس کو حاصل ہو وہ خوش نصیب ہے اور جس کو حاصل نہ ہو وہ بدنصیب ہے۔

اب ایک طرف اس معیار کو نظر مین رکھئے اور دوسری طرف دیکھئے کہ جس شخص کو بخت یار رسا ہین ملتا یعنی جس کی خواہشین اور ارادے ہمیشہ پورے ہوتے رہتے ہین وہ عیش و آرام مین پڑ کر خدا کو بھول جاتا ہے اور خدا شناسی اور خدا پرستی سے محروم ہو کر ارادہ پرست ہو جاتا ہے۔ مکرمی جناب سید آل رضا صاحب نے ذیل کے شعر مین اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کام ہرے بھرے بنا کے بن نہ سکین خدا کرے
تو ہر کہین شک آ نہ جائے قدرت کارساز مین

اس کے برخلاف جس شخص کی زندگی تلخیون اور ناکامیون مین

گذرتی ہے اُس کا دھیان خدا کی طرف مائل رہتا ہے اور اس میں
ارادہ پرستی پیدا نہیں ہونے پاتی۔ ایک قدیم شاعر کہہ گیا ہے

"دُکھ میں ہر کو سب بھجیں اور سُکھ میں بھجے نہ کوئے"

غرضکہ بالعموم رنج و الم کی زندگی ایک ہی ہوتی ہے بخت نارسا انسان
کو خدا شناس اور بخت رسا ارادہ پرست بنا دیتا ہے اور چونکہ شاعر
کے معیار کے مطابق خوش نصیبی کا انحصار خدا شناسی کے حاصل ہونے
اور نہ ہونے پر ہے۔ اس لئے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ جس کو بخت نارسا ملے
وہ خوش نصیب ہے اور جس کو نہ ملے وہ بد نصیب ہے۔

اب ذرا شعر کے انداز بیان پر نظر کیجئے۔ خوش نصیبی اور بد نصیبی کا
معیار بتانا شاعر کا مقصود نہیں ہے اس کے نزدیک تو مذکورہ معیار
بالکل مسلم ہے۔ اس لئے وہ اپنے بخت کی نارسائی پر پست خیال لوگوں
کی طرح واویلا نہیں مچاتا بلکہ خوش ہوتا ہے اور فخر کے لہجے میں کہتا
ہے۔ خدا شناسی اور خدا پرستی کی اگر تلاش ہو تو مجھ سے خوش نصیبوں
کو دیکھو جنھیں بخت نارسائی کی بدولت یہ فضیلتیں حاصل ہوئی ہیں۔

شاعر نے اس خیال کی بنا پر ظاہری بد نصیبی کو حقیقی خوش نصیبی
سمجھا ہے اور اس طرح نظم میں خوشی مصیبت میں تسکین اور یاس میں
امید کا ایک زبردست پہلو نکال کر اپنے دل کو افسردہ اور ہمت
کو مردہ نہیں ہونے دیتا۔ اور مردانہ وار تمام تکلیفوں کا مقابلہ
کرنے کو تیار رہتا ہے۔

یہ شعر مبنی ہے۔ حضرت علیؑ کے اس حکیمانہ قول پر عرفت ربی بفسخ
العزائم" یعنی میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے فسخ ہو جانے سے پہچانا
الناس سمجھو۔ جناب مؤلف سمجھ لیتے ہیں ناکامی پیہم کا یہ اثر بھی ہوتا ہے انسان
ہستی واجب کا انکار کر بیٹھتا ہے اس میں شک نہیں کہ مصرع ثانی (وہ بدنصیب ہے بخت نارسا
نہ ملا) میں صاحب بخت رسا کو بدنصیب کہنا ایک جدت ہوتا اور
اس کی داد نہ دینا مشرب سخن فہمی میں کفر قرار پاتا اگر یہی کہ شعر بے معنی
نہ ہوتا مصیبت تو یہ کہ اچھا شعر نام ہے دو مصرعوں کے مجموعہ کا
جس میں کوئی مفہوم شعریت لئے ہوئے ادا ہو جائے مگر افسوس کے
ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس شعر میں کوئی مفہوم ادا ہی نہیں ہوا
شاعر کا مفہوم ذہنی تو یہ ہے کہ جس خود پرست (مغرور) کو بخت نارسا
نہ ملا وہ بدنصیب ہے خودی کا بندہ ہے خداشناس نہیں
لیکن الفاظ شعر ادائے مطلب میں قاصر ہیں اور زبان الکن سے
بھی زیادہ قاصر اس شعر میں دو غلطیاں ہیں انہیں سے ایک غلطی تو
اس لفظ کی ہے جس نے شعر میں ندرت خیال و جدت ادا کی جھلک
دکھائی تھی۔ مگر ایک تاؤ کی کسر رہ گئی اور صرف تانبے کے بالائی سطح پر
کندن کی جھلک پیدا ہوسکی باطن سیاہ کا سیاہ رہ گیا وہ جھلک بھی
نگاہ نقاد کی گرمی پاکر اڑ گئی اور اب اس کی جگہ خالی سیاہی باقی رہ گئی ہے
شعر کی پہلی غلطی تو یہ ہے کہ شاعر نے تعمیم کی شان پیدا کردی
جو عقل و مشاہدہ دونوں کے خلاف ہے ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ

ہر ایک ایسا آدمی بدنصیب ہے جو ہمت نارسا رکھتا ہو اس قول
کا صریح البطلان ہونا ظاہر ہے ایسے اقبالمند لوگ نایاب نہیں جو
اپنے ارادوں میں بڑی کامیاب ہوتے ہیں اور اُن کی بندگی اوج
کمال کے مدارج طے کرتی جاتی ہے اور آخر میں ہمہ تن بندگی اور
سراپا نیاز بن کر رہ جاتے ہیں بابر ابراہیم لودی اور رانا سانگا کے
معرکوں میں مظفر و منصور ہوتے ہی سجدۂ شکر میں گرتا ہے اور بہت سے
شاہنشاہ جب اپنی تمناؤں میں کامیاب ہوتے ہیں سجدۂ نیاز میں
اُن کی پیشانی زمین عجز کو بوسے دیتی نظر آتی ہے اگر مبسوط اور مستند
تاریخیں دیکھنے میں تکلیف ہو تو صرف سیر المتاخرین کا مطالعہ ہی منکر
کی تسکین قلب کے لئے کافی ہوگا ہاں ایسے اوچھے ایسے کم ظرف
بھی ہیں مگر بہت کم ہیں جو ایک چلو میں بہک اُٹھتے ہیں بلکہ ایک
بوند میں چھلک اُٹھتے ہیں جناب ذوق علیہ الرحمہ کو یہی مفہوم ادا
کرنا تھا ادا کیا مگر ضروری قیدوں کے ساتھ

نشہ دولت کا بد اطوار کو جس آن چڑھا
سر پہ شیطان کے اک اور بھی شیطان چڑھا

ذوق

اس تعمیم نے شاعر کا بسا بسایا گھر اجاڑ کے رکھ دیا۔

میں نے یہ زحمت صرف ہماری شاعری کے مولفوں کی خاطر
سے گوارا کی ورنہ مشاہدات عام کے متعلق نہ کسی دلیل کی حاجت

ہوتی ہے نہ کسی ثبوت کی ضرورت

دوسری غلطی۔ پہلے مصرع یعنی بجز ارادہ پرستی خدا کو
کیا جانتے ہیں ارادہ پرستی کا ٹکڑا مراد قائل سے بیزار ہے اس
لئے کہ شاعر کا مفہوم ذہنی صرف یہ تھا کہ بعض ایسے لوگ جو
اپنی ہر تمنا اور اپنے ہر ارادہ میں کامیاب ہوتے ہیں وہ مغرور
و خود پرست ہو جاتے ہیں اور خدا دانی و خدا پرستی و خدا
شناسی سے دور جا پڑتے ہیں اپنے امور میں خدا سے برکت نہیں
چاہتے شکر انعمت میں زبان نہیں ہلاتے دعا کے لئے ہاتھ نہیں
اٹھاتے بلکہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دنیا ہماری ہے جو ہم چاہتے ہیں
وہی ہوتا ہے بلکہ زمانہ ہم ہیں جسے چاہیں معراج پر پہونچائیں
جسے چاہیں تحت الثری میں گرا دیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا
ہے کہ خدا کو بھول جاتے ہیں اور یہی انتہا کی بدنصیبی ہے مگر
خود پرستی یا خودی کا مفہوم ادا کرنے والا کوئی لفظ شاعر
مصرعہ اولیٰ کو شامل نہ کر سکا اور لگی اُلٹی گنگا بہنے۔ میں اپنے مفہوم کو زیادہ
واضح کئے دیتا ہوں۔ ارادہ پرستی۔ ارادہ کی پرستش کرنا
ظاہر ہے کہ یہ ٹکڑا اپنے اصلی مفہوم کے خلاف ہے کیونکہ ایسے
لوگ ارادہ کی پرستش کرتے ہیں ارادہ خود اُن کی پرستش کرتا
ہے یعنی ادھر ارادہ ہوا ادھر کامیاب ہو گئے شاعر نے یہاں تشبیہ
[illegible] کو تشبیہ بنا دیا ایسا [illegible] کہ خدا سے [illegible]

تھا وہ بندہ ہے اس لئے جب تک ارادہ پرستی کا ٹکڑا شعر میں موجود
ہے معنی کرسی نشین ہو نہیں سکتے اور لفظوں میں تلوار چل جانا اسی
کا نام ہے ارادہ کی پرستش کرتے ہیں وہ لوگ جو بار بار اپنی
کوششوں میں ناکام رہتے ہیں مگر اس کام کو یہ کہکر نہیں چھوڑ
بیٹھتے کہ بھاری پتھر دیکھا چوم کر چھوڑ دیا اور چھوڑتے کیوں نہیں
اس لئے کہ بات کے دھنی اور دھن کے پکے ہوتے ہیں۔

اگر وہی مفہوم ادا کرنا تھا جو ہم نے شاعر کے مفہوم ذہنی کے
تحت میں بیان کیا ہے اور جس کے سوا کوئی مفہوم صحیح اس محل
پہ ہو ہی نہیں سکتا تو ارادہ پرستی اور بدنصیب کے ٹکڑوں کو
آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا تھا اور یوں کہنا چاہئے تھا۔ ؎

خودی کے بت کا ہے بندہ خدا کو کیا جانے
وہ خود پرست جسے بخت نارسا نہ ملا

ندرت خیال اس شعر میں تھی ہی نہیں اس لئے کہ یہ عرفت
ربی بفسخ العزائم کے مشہور قول کا چربا ہے جدت ادا کی چھاؤں البتہ
ضرور پڑی تھی مگر پڑتے ہی غائب ہو گئی اس کا سبب یہ ہے کہ
شاعر نے ادائے مطلب کی بنیاد لفظ "بدنصیب" پہ رکھی تھی وہ
شعر میں کسی طرح نہ رہ سکی اور اسے "پرغرور" یا "خود پرست" کیلئے
جگہ خالی کرنی پڑی تو جب نیو ہی اکھڑ گئی تو وہ سربفلک کشیدہ
عمارت جو صرف مصنف کے عالم خیال میں جلوہ گر تھی اڑا کے

بیٹھ گئی انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مجھے اس محل پر اپنا یہ شعر بے ختیار یاد آتا ہے ۔

بیخود موہانی

خیال آرزو ہی تھا کہ یاس نے یہ دی خبر
وہ کھیت تیر اڑ گیا ابھی جو بن چکا نہ تھا

اب اگر جناب ادیب کی شرح کا خیال کرکے سکوت کیا بھی جائے تو لسان الغیب کی یہ آواز فضا میں گونج رہی ہے ۔

ع این دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

باقی آئندہ

یار زندہ صحبت باقی

بندۂ ناچیز خاکسار محمد احمد بیخود موہانی
(ایم۔اے منشی فاضل)
پروفیسر شیعہ کالج لکھنؤ
۱۵ نومبر ۱۹۳۶ء